# میر غلام بھیک نیرنگ کی ایک نادر تحریر: اردو زبان اور فسانہ نگاری

داؤد عثمانی*

اردو ناول اور اس کے فن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا لیکن اس کے ابتدائی نقوش ہمیں جن کتابوں میں نظر آتے ہیں ان میں دنیاے افسانہ (محمد عبدالقادر سروری)[۱]، افسانہ (مجنوں گورکھپوری)[۲]، ناول کی تاریخ اور تنقید (سید علی عباس حسینی)[۳]، اردو ناول نگاری (ڈاکٹر سہیل بخاری)[۴]، ناول کیا ہے (احسن فاروقی و نورالحسن ہاشمی)[۵] اور اردو ناول کی تنقیدی تاریخ (ڈاکٹر احسن فاروقی)[۶] وغیرہ شامل ہیں تاہم ان سب میں جسے اولیت حاصل ہے وہ محمد عبدالقادر سروری کی کتاب دنیائے افسانہ ہے جو ۱۹۲۷ء میں مکتبہ ابراہیمیہ اتحادی، حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی جس کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

> اردو زبان میں افسانوی ادب کا کافی ذخیرہ موجود ہے اور ہر قسم کے اچھے برے قصوں پر مشتمل۔افسانوں کی پیدائش کا سلسلہ برابر جاری ہے بلکہ اس کی رفتار اب مقابلۃً تیز ہوگئی ہے۔ایسی صورت میں اس کی ضرورت ہے کہ افسانوں کے ساتھ ساتھ افسانوں کے فن کی طرف بھی توجہ کی جائے اور اردو زبان میں بھی وہی اصول اور قواعد مروج کیے جائیں جو مغربی زبانوں میں مروج ہیں کسی زبان میں افسانے کے فن پر ادب کا پیدا ہونا اس بات کا کافی ثبوت ہوتا ہے کہ اس زبان کے افسانوں کو فن کا رتبہ حاصل ہو چکا ہے[۷]۔

اردو ناول پر جو ابتدائی مضامین لکھے گئے ان میں اردو زبان اور فسانہ نگاری (میر غلام بھیک نیرنگ)[۸]، اردو زبان اور ناول (نوبت رائے نظر)[۹]، ناول نویسی (اے۔ایچ۔)[۱۰]، ناول نویسی (سید لطافت حسین)[۱۱] اور قصہ نویسی (ضیاءالدین شمسی)[۱۲] وغیرہ شامل ہیں۔

ان مضامین میں ناول اور اس کے فن پر نہایت اہم مضمون ''اردو زبان اور فسانہ نگاری'' ہے جسے میر نیرنگ[۱۳] نے تحریر کیا اور ماہ نامہ مخزن[۱۴]، لاہور میں مارچ ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا۔یوں تو یہ مضمون سید سجاد حیدر یلدرم کے ناول زہرا پر ہے لیکن اس میں ناول کے فنی اصولوں پر بھی بات کی گئی ہے۔

میر نیرنگ جن کا اصل نام غلام محی الدین تھا۔ان کی پیدائش ضلع انبالہ، تحصیل دورانہ میں ستمبر ۱۸۸۶ء میں ہوئی

* استاد، گورنمنٹ بوائز ڈگری کالج، بلدیہ ٹاؤن، کراچی، مقیم کراچی

اور وفات ۱۶/اکتوبر ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ ان کے والد سید قاسم علی ایک دین دار بزرگ تھے۔ ان کی تعلیم واجبی تھی لیکن عربی وفارسی زبانوں اور علوم دینیہ میں دسترس حاصل تھی۔ حافظ قرآن بھی تھے۔ ان کا ذریعہ معاش زمینداری تھا۔ میر نیرنگ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ دین داری اور اسلامی شعار سے عبارت تھا۔ لہٰذا درس قرآن، دینی علوم سے واقفیت اور ابتدائی عربی وفارسی کی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی۔ قرآن کی تعلیم والدہ ماجدہ نے دی اور اس کے بعد چچازاد بھائی سید غلام شبیر سے علوم دینیہ اور عربی وفارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ابتدائی گھریلو تعلیم وتربیت کے بعد مروجہ تعلیم کے لیے اسکول میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۵ء میں مشن ہائی اسکول انبالہ سے پنجاب یونی ورسٹی کے تحت انٹرنس کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا اور اُسی سال گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے جہاں بہت جلد کئی لائق طلبہ ان کے دوست بن گئے جن میں علامہ اقبال، چودھری جلال الدین وغیرہ سرفہرست رہے۔ بی۔ اے۔ میں امتیازی حیثیت سے کامیابی حاصل کرنے کے بعد ۱۸۹۹ء میں قانون کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۰۰ء میں انبالہ میں وکالت شروع کردی اور کچھ ہی دنوں میں ان کی ذہانت اور قانون دانی کے سبب انبالہ میں بہت جلد شہرت اور بلند مقام حاصل ہوگیا۔ جس کی بدولت ۱۹۰۱ء میں وہ میونسپل کمشنر بھی منتخب ہوئے پھر ۱۹۰۹ء میں وکالت ترک کرکے سرکاری وکیل کی حیثیت سے ''پبلک پراسیکیوٹنگ انسپکٹر'' کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ جہاں ۱۹۲۰ء تک فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔

میر نیرنگ کی پوری زندگی مسلمانوں کی تعلیمی، سیاسی، مذہبی اور سماجی زندگی کی اصلاح وترقی کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ جیسے انبالہ میں ہندوؤں اور سکھوں کے لیے علاحدہ علاحدہ اسکول قائم تھے۔ وہاں مسلمانوں کے لیے بھی ایک علاحدہ اسکول کے قیام کو اپنی کوششوں سے عملی جامہ پہنایا۔ پھر جب تحریک خلافت کو کامیاب بنانے کے لیے ترک موالات شروع ہوئی تو نیرنگ صاحب نے بھی دوسرے بے شمار پُرخلوص مسلمانوں کی طرح اپنی سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور دوبارہ وکالت شروع کردی اور قیام پاکستان تک پنجاب ہائی کورٹ سے منسلک رہے۔

جب ہندوؤں نے ''شدّھی'' کی تحریک شروع کی تو اس کے شر سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ''جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام'' کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی۔ نیرنگ صاحب حج پر گئے۔ وہاں مسجد نبوی کی خستہ حالی دیکھ کر اُس کی بہتری کے لیے ہندوستان آکر ''خادمان حرمین'' کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ الور کی مسلم رعایا کو وہاں کے راجہ کے ظلم وستم سے نجات دلانے کے لیے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے تحت، جس کے وہ معتمد اور علامہ اقبال صدر تھے، ایک وفد تشکیل دیا جس نے شملہ جاکر وائسرائے کو الور کے مسلمانوں پر جاری تشدد سے آگاہ کیا جس کے نتیجے میں وائسرائے نے راجہ کو معزول کردیا اور جب جامع مسجد جے پور کے دروازے اور سیڑھیوں کی تعمیر پر ہندوؤں اور پولیس نے مسلمانوں پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں کئی مسلمان شہید اور زخمی ہوئے، اُسے قومی مسئلہ سمجھتے ہوئے اُس پر خاص توجہ دی اور ان کی کوششوں سے وہاں کی ریاست نے مسلمانوں کے متعدد مطالبات تسلیم کرلیے۔ اس کے ساتھ ساتھ نیرنگ قومی سیاست میں بھی بڑھ چڑھ کر

حصہ لیتے رہے۔

میر نیرنگ ایک اچھے شاعر، ادیب، نقاد، مبصر اور مترجم بھی تھے۔ ان کا شعری مجموعہ کلام نیرنگ ہے جو ان کی منظومات اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے مرشد اشرف کچھوچھوی کے فارسی اور اردو، ہندی کلام کے مجموعے تحائف اشرفی کی ترتیب واشاعت کی۔ نیز ان کی ایک کتاب غبار افق ہے جس میں ہندوستان میں ارتداد کی ایک مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ ان مستقل تصانیف کے علاوہ میر نیرنگ سے چند روداد یں اور کتابچے اور خطبات بھی یادگار ہیں جو انھوں نے مختلف مواقع پر بہ طور خطبات صدارت پیش کیے۔ ''جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام'' کی ۱۷ سالہ خدمات کا خلاصہ ''جمعیۃ مرکزیہ الاسلام کے مختصر حالات''، ''مجلس خادمان حرمین'' اور ''ریاست الور اور اس کی مسلم رعایا'' (اردو اور انگریزی) بھی ان سے یادگار ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد مضامین ومقالات بھی تحریر کیے جو ماہ نامہ مخزن اور ہمایوں وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ سطور آئندہ میں ناول نویسی اور سجاد حیدر یلدرم کے ترکی زبان سے ترجمہ کردہ ناول زہرا پر نیرنگ کا نادر مضمون پیش خدمت ہے:

## اردو زبان اور فسانہ نگاری

ظاہر ہے کہ ہم نئی تعلیم والوں کے خیالات علم ادب کے بارے میں گذشتہ نسلوں کے خیالات سے بہت کچھ مختلف ہیں اور ہمارے مذاق کے موافق اردو زبان میں اچھی کتابوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ ہزاروں کتابیں چھوٹی بڑی ہر قسم اور ہر خیال کی لکھی جاتی ہیں اور شائع ہوتی ہیں مگر جس رنگ کو ہم ڈھونڈ رہے ہیں وہ ابھی نسبتاً کبریت احمر کا حکم رکھتا ہے۔

علوم وفنون کی کتابیں علمی طریقے سے اردو میں تصنیف ہونا تو ابھی صدیوں کا کام ہے۔ محض فسانہ نگاری بھی تو ہماری زبان میں اچھی حالت پر نہیں۔ سرور لکھنوی کے فسانہ عجائب، سخن دہلوی کے سروش سخن اور میر امن دہلوی کی باغ وبہار کا زمانہ اب گزر گیا۔ مولانا نذیر احمد، پنڈت رتن ناتھ سرشار مرحوم اور مولانا شرر کی تصنیفات نے فسانہ نگاری کو مغربی فسانہ نگاری کے بہت کچھ قریب لانے کی کوشش کی اور جو کچھ بھی کامیابی ان حضرات کو ہوئی وہ نہایت ہی غنیمت ہے اب یہ نئی روشنی کے نوجوانوں کا کام ہے کہ اس فن کو تکمیل کے درجے تک پہنچائیں۔ یہ تکمیل کئی طرح سے حاصل ہوسکتی ہے:

اوّل: انگریزی یا مغربی زبانوں سے اچھے سے اچھے فسانوں کا ترجمہ کرنا تاکہ پڑھنے

والوں کو اپنی زبان میں ایک نمونہ نظر آئے جس کی تقلید سے وہ عمدہ فسانے لکھ سکیں۔
دوم: ان غیر زبانوں کے اچھے فسانوں کا انتخاذ کرنا[1]۔
سوم: طبع زاد فسانے بہ لحاظ اصول فسانہ نگاری اردو زبان میں لکھنا۔
چہارم: جو فسانے اس طرح ترجمہ یا انتخاذ یا تصنیف ہو کر شائع ہوں اُن پر تقریظیں نہیں بلکہ بے لاگ تنقیدیں لکھ کر شائع کرنا تا کہ اصول فسانہ نگاری سے پڑھنے والوں کو اطلاع دی ہو اور لوگ اس فن کی باریکیوں کو سمجھنے لگیں کیوں کہ جب تک ایک فسانہ فہم پبلک پڑھنے کے لیے موجود نہ ہوگا تب تک ہماری فسانہ نگاری کی یہی ردی حالت رہے گی جو اس وقت ہے کہ تخریب اخلاق اور تضیع اوقات وزر کے سوا عموماً فسانوں کے مطالعے سے اور کچھ حاصل نہیں۔

ایک عمدہ فسانہ آج کل اردو زبان میں شائع ہوا ہے ہم چاہتے ہیں کہ اُس پر تنقید لکھنے کے بہانے سے فسانہ نویسی پر ایک چھوٹا سا مضمون لکھیں۔

اس عمدہ فسانے سے ہماری مراد زہرا ہے یہ ایک ترکی فسانے کا ترجمہ سید سجاد حیدر صاحب بی۔اے۔ کا کیا ہوا ہے۔ قابل مترجم کے نام سے اردو ادب کے شائق اچھی طرح واقف ہیں۔ امریکہ کے نادر الخیال مضمون نگار امرسن کا قول ہے کہ ''کسی اچھے فقرے کے موجد سے دوسرے درجے پر وہ ہے جو اُس کو سب سے پہلے انتخاب و اقتباس کرے۔'' پس اگر ہم اس فسانے کی تعریف کرتے ہیں تو اُس میں لازمی طور پر مترجم کے ذوق سلیم اور حسن انتخاب کی تعریف مضمر ہے۔

---

۱۔ انتخاذ انگریزی لفظ (adaptation) کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ میری رائے میں حتی الامکان علم وادب کی انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ اردو میں کر کے عام طور پر رواج دینا ضروری ہے۔ اگر اصطلاحات کا ترجمہ بالکل لفظی نہ بھی ہو سکے تو کوئی مضائقہ نہیں جو ترجمہ بعد غور وفکر انسب سمجھ کر کیا جائے گا رفتہ رفتہ وہی کثرت استعمال سے اصطلاح بن جائے گا اور لوگ اس کے اصطلاحی معنوں سے مانوس ہو جائیں گے۔ ہر زبان کی اور علم کی اصطلاحات اسی طرح بنتی ہیں۔ پس میں اس مضمون میں بعض اصطلاحات کے ترجمے حسب ذیل کرتا ہوں۔ ناظرین غور کریں اگر اصلاح کی ضرورت اور امکان ہو تو اس کی اصلاح کر دیں ورنہ ان ترجموں کو قبول کریں۔ ہیرؔ ممدوح۔ ہیرؔوان [یعنی ہیروئین] ممدوحہ۔ پلاٹ۔ نقشہ۔ کیرکٹر، خصلت یا شخص (حسب موقعہ) ناول، فسانہ۔ ممدوح کی گنجائش ہے مگر ہیرؔو کا لفظ انگریزی میں ایسا ہے کہ میکبتھ جیسا ظالم اور بے ایمان شخص بھی ایک ناٹک کا ہیرو ہے گویا ایک بدمعاش (villain) کو اصطلاحاً ہیرو کہا جاتا ہے۔ پس ہمارے ہاں جب ایسا موقع ہوگا تو ہم بھی کسی بدمعاش کو جو دراصل ''مذموم'' کہلانا چاہیے

بطور ہجو ملیح ممدوح کہہ لیں گے۔ نیرنگ

قصے کا ڈھانچہ نہایت سادہ ہے۔ عثمان بک اور اُس کی بیوی فسانے کی ممدوحہ زہرا کو پالتے ہیں۔ زہرا عثمان بک کے بھائی کی یتیم بچی ہے۔ عثمان بک کا لڑکا رضا اور زہرا اور ایک چرکس لڑکی دل نواز نامی تینوں اکٹھے اس گھر میں بچپن سے پرورش پاتے ہیں۔ زہرا جوان ہوتی ہے تو حمدی بک نامی ایک شراب خوار اور آوارہ نوجوان اُس سے شادی کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ عثمان بک ایسے شخص کے ساتھ اپنی چہیتی بھتیجی کی شادی کب کرنے لگا تھا۔ صاف جواب دے دیا۔ چند روز بعد زہرا اور رضا کی شادی ہوگئی اور عثمان بک مر گیا۔ دل نواز کو خیال تھا کہ رضا کی شادی مجھ سے ہوگی اُس کو اپنی محرومی کا بڑا داغ ہوا اور یہاں سے زہرا کی مصیبتوں کا آغاز ہے۔ شادی سے ایک سال بعد رضا وطن سے کچھ دور نوکری پر چلا گیا۔ پیچھے زہرا کی لڑکی پیدا ہوئی اور عین اُس لڑکی کے تولّد کے دن رضا کی جانب سے طلاق بائن کا خط آ گیا۔ کیوں کہ دل نواز کی پیچیدہ کارروائیوں کی وجہ سے رضا کو اُس کے ایک معتبر نے لکھ بھیجا تھا کہ زہرا حمدی بک سے ناجائز تعلق رکھتی ہے۔ زہرا اپنی نوزائیدہ لڑکی اور رضا کے مکان کو چھوڑ کر فوراً اپنے ماموں کے ہاں چلی گئی کچھ عرصے کے بعد یہ دیکھ کر کہ ماموں پر اس کا رکھنا بار ہے دیوانہ وار نکل کھڑی ہوئی اور بہت کچھ تکلیف اُٹھانے کے بعد ایک عورت کے ہاں جا کر پناہ گزیں ہوئی جو اسے جانتی تھی اور جو لوگوں کو نوکر بہم پہنچایا کرتی تھی۔ اس اثنا میں رضا دل شکستہ ہو کر وطن میں چلا آیا ہے۔ زہرا کی یاد کو بھی دل سے بھلا چکا ہے اور شادی کر چکا ہے۔ رضا کو نوکر کی ضرورت ہوئی اور اُس نے نوکروں کی دلّالہ کے پاس اپنا آدمی بھیجا۔ وہاں سے زہرا بطور نوکر کے رضا کے ہاں بھیجی گئی۔

زہرا کا مطلب یہ تھا کہ کسی بہانے سے اپنی لڑکی کو دیکھ آئے۔ وہاں دل نواز نے اس کو دیکھا۔ دل نواز کو ایک عرصۂ دراز سے اپنی کرتوت پر پشیمانی تھی اور اس پشیمانی نے رفتہ رفتہ اُسے دیوانہ سا کر دیا تھا۔ اب جو زہرا کو دیکھا تو وہ دیوانگی جوش پر آئی رات کو ایک کاغذ پر اصلی واقعات یعنی زہرا کی بے قصوری اور اپنے جرم کا اعتراف لکھ کر رضا کی میز پر چپکے سے رکھ دیا اور خود باغ کے [کنویں] میں ڈوب مری۔ اُدھر زہرا کا راز کھل گیا اور رضا نے اُسے اپنے مکان سے نکال دیا۔ زہرا مکان سے گئی ہی تھی کہ دل نواز کا کاغذ

رضا کو مل گیا۔ انجام یہ کہ دل شکستہ اور حواس باختہ ہو کر رضا اپنے دفتر کو چلا گیا۔ وہاں کچھ دیر بعد اطلاع ملی کہ شہر میں آگ لگ گئی ہے۔ آگ کو بجھانا رضا کی ماتحت رجمنٹ کا کام تھا۔ فوراً یہ وہاں پہنچا اور نوکروں کی دلّالہ کے مکان کو شعلہ زن پایا۔ اس مکان کے اوپر کی منزل سے ایک عورت کو نکالنے کے لیے رضا کمند لگا کر چڑھ گیا۔ مگر وقت گزر چکا تھا صرف اسی قدر فرصت تھی کہ رضا نے اس عورت کو پہچان لیا وہ زہرا تھی۔ رضا نے اُس سے اعتراف جرم کیا اور رو رو کر معافی مانگی کہ اتنے میں چھت جل کر دونوں پر آ پڑی اور یہ عرصہ کی بچھڑی ہوئی روحیں اس آگ میں آخر کار ہمیشہ کے لیے مل گئیں اور یہ آگ ان کے لیے گل زار خلیل بن گئی۔

عموماً افسانوں کو تین باتوں کے لحاظ سے دیکھا کرتے ہیں۔ نقشہ، خصائل نگاری اور مکالمہ۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی باتیں قابل غور ہوتی ہیں مثلاً جس قوم، زمانے، ملک اور مقام سے فسانے کا تعلق ہے از روے واقعات اُس قوم، زمانے، ملک اور مقام پر اُس فسانے کا صادق آنا بھی ممکن ہے یا نہیں۔ مگر ہم ذیل کی مختصر بحث میں زیادہ تر خصائل نگاری اور نقشے ہی کا ذکر کریں گے۔

خصائل کے لحاظ سے زہرا ایک کامل اور روح پرور تصویر ہے۔ یہ لڑکی حسن اور حیا، محبت اور وفا، عفت اور صفا، ذہانت اور ذکا، تہذیب اور اتقا کا ایک نورانی پتلا ہے۔ عثمان بک کے گھر میں اس کے دم سے بہشت بریں کی سی رونق ہے۔ عثمان اور اس کی بیوی سے اس کی محبت اور رضا سے اس کی ابتدائی ہمشیرانہ الفت عثمان کے خاندان کی خوش حالی کا ایک جزو اعظم ہے۔

اس پیکر حسن کامل کے مقابلے میں دل نواز ہے جس کو خدا نے حسن ظاہر کثرت سے دیا ہے مگر حسن باطن سے جس قدر زہرا بافراط بہرہ ور ہے اُسی قدر دل نواز محروم ہے۔ دل نواز کا اس فسانے میں ہونا ضروریات سے تھا کیوں کہ اوّل تو زہرا کی کامل نیکی اس حسین شیطان کی بدطینتی کے مقابلے میں اور بھی چمک کر اپنا جلوہ دکھاتی ہے اور استادان فن ایسا مقابلہ اکثر کرتے ہیں اور یہ وہی عالم گیر اصول ہے کہ ''الاشیاء تعرف باضدادہا''۔ دوسرے دل نواز نہ ہوتی تو زہرا پر مصیبتیں کہاں سے آتیں؟ اور مصیبتیں نہ آتیں تو زہرا کے محاسن کہاں سے کھلتے؟ اُس کی یہ بے نظیر حمیت اور خودداری کہ نفقۂ نکاح

کو نفرت کے ساتھ واپس کر دیا اور ماموں کا بار خاطر ہونا گوارا نہ کیا اور اُس کی مادرانہ محبت کی وہ تڑپ کہ جس گھر میں مالک بن کر حکومت کر چکی تھی اُس گھر میں نوکر بن کر جاتی ہے تا کہ اپنی پیاری بچی کو ایک نظر دیکھ لے۔ اُس کا صبر اور استقلال کہ حالت طلاق کی تکلیفوں کو برداشت کیا۔ اگر دل نواز نہ ہوتی تو زہرا کے یہ جوہر کیوں کر ثابت ہوتے؟

مگر دل نواز بھی نری شیطنت نہیں ہے۔ اگر فسانہ نگار اُس کو ایسا بنا دیتا تو وہ اصول فن سے بہت دور جا پڑتا۔ اُس میں بھی آخر عورت پن ہے۔ وہ رشک اور حرمان کی تلخی میں ایک حرکت تو کر بیٹھی (اور یہ حرکت اُس سے اس قدر سوچ بچار کے بعد سرزد ہوئی ہے کہ ہم اس کو رشک اور حرمان کے عذر پر بھی ہرگز معاف نہیں کر سکتے) مگر جب اُس حرکت کا خوف ناک نتیجہ واقعیت کی شکل اختیار کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے آ کھڑا ہوا اور زہرا ایک غم زدگی اور مصیبت کے عالم میں اپنے خاوند کے گھر کو چھوڑ کر چلی تو دل نواز کے دل میں فوراً پشیمانی نے چٹکی لی۔ یہ پشیمانی اُس وقت اور بھی بڑھ گئی جب دل نواز نے دیکھا کہ زہرا کو میں نے تباہ بھی کر دیا اور رضا نے پھر بھی مجھ سے شادی نہ کی اگر دل نواز خباثت مجسم ہوتی تو وہ یہ سمجھ کر خوش ہوتی کہ مجھ سے تو رضا گیا ہی تھا مگر اپنی حریفہ کے قابل بھی اُسے میں نے نہیں چھوڑا۔ ع

لے ہم تو نکلے ولے مصاحب رقیب تو بھی نہیں رہے گا

مگر وہ آخر انسان ہے اور انسان بھی عورت ہے اُس کی طینت پھر نرمی کی طرف مائل ہے پس پشیمانی اور پچھتاوے کے گھُن نے اُس کی زندگی کو کھا کھا کر کھوکھلا کر دیا اور اس بے مزگی سے آخر وہ جنون کے قریب پہنچ گئی۔ دل نواز کے دل کی اس تغیر کو مصنف نے خوب تدریج کے ساتھ بیان کیا ہے اور ہم اُس کی مصوری کی داد دیتے ہیں۔ یہ تصویر شیکسپیئر کی لیڈی میکبتھ سے بہت کچھ مشابہ ہے اور یہ کچھ تھوڑی سی تعریف نہیں ہے۔

رضا بک بچپن میں کچھ دائم المرض سا رہ چکا ہے۔ اس سے اس کی طبیعت کچھ زود اثر حساس اور جوشیلی سی ہو گئی ہے۔ قصے کے آغاز میں ہی ہمیں اس امر کا پتا لگ جاتا ہے اور ہم اس مزاج کے آدمی سے بالکل توقع رکھتے ہیں کہ جب اُس کو یکا یک خبر پہنچے کہ اس کی پیاری نے جس پر وہ تن من دھن سب قربان کر چکا ہے اور جس کی وفا شعاری پر اُس کو کبھی ایک لمحے کے لیے بھی شک نہیں ہوا اُس کی عزت کو خاک میں ملا دیا تو وہ مجنون سا بن جائے

اور جوش کے عالم میں فوراً بلا تحقیقات طلاق جیسی سخت سزا اپنی پیاری کو دے بیٹھے۔

رضا اور زہرا کی محبت بچپن سے شروع ہوئی۔ اوّل اوّل وہ محض بہن بھائی کی طرح ایک دوسرے سے محبت رکھتے تھے۔ جب دونوں نے حدود شباب میں قدم رکھا تو اس محبت نے ایک اور رنگ اختیار کرنا شروع کیا۔ اور دونوں کو بجائے خود علاحدہ علاحدہ یہ خیال پیدا ہوا کہ اُس کے بغیر میری زندگی تلخ نہ رہے گی؟ دونوں میں سے ہر ایک کو یہ بدگمانی ہے کہ میں تو اسے ہزار جان سے چاہتا ہوں مگر شاید مجھ سے اس کو محض رشتے کی ہی محبت ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ آخر اس خیال کی ترقی ہوتے ہوتے حالات اس مرحلے تک پہنچ جاتے ہیں کہ رضا شام کے وقت باغ میں بیٹھا ہے چاند بھی ہے تارے بھی ہیں، باغ بھی ہے بہار بھی ہے، ہوا بھی سرور انگیز ہے اور تمام سماں بہجت خیز ہے ''مگر دور افق میں جو ستارے چمک رہے تھے نظر اُن پر گڑی ہوئی تھی اور صرف۔۔۔ صرف زہرا کا خیال دل میں تھا۔'' یہ منظر نہایت پیارا اور دل آویز ہے اور ہم کو یاد نہیں کہ اس سے زیادہ دل کش اس سے زیادہ روحانیت لیے ہوئے کوئی اور نظارہ اعتراف الفت کا ہم نے ادب میں پڑھا ہو۔

رضا کی خصلت نہایت مردانہ ہے مگر سوائے ایک گونہ عصبیت اور ترکانہ حمیت کے کوئی خاص بات اُس میں ایسی نہیں کہ جس کی وجہ سے اُس کو نرالا اور انوکھا سمجھا جائے وہ ایک نیک آدمی ہے اور بس۔

اس فسانے کا نقشہ بہت اچھا ہے مگر اس میں کافی پیچیدگی نہیں ہے۔ ایک لازمہ اچھے نقشے کا یہ ہے کہ آخر تک دلچسپی اور راز جوئی کو قائم رکھ سکے۔ یہ نہ ہو کہ تانت باجی اور راگ پہچانا۔ قصے کا کچھ حصہ پڑھا اور سمجھ گئے کہ انجام یہ ہونے کو ہے۔ جس قصے میں انجام کے بارے میں دو دلی اور ایک گونہ خوف و رجا آخر تک قائم رہے وہ قصہ از روے نقشہ اچھا سمجھا جاتا ہے۔ یہ لازمہ زہرا میں موجود ہے مگر اس قسم کی پیچیدگی نقشے کے اندر موجود نہیں ہے کہ اس نقشے کو خصوصیت کے ساتھ قابل داد سمجھا جائے۔ نقشہ ہے اچھا ہے بہت اچھا ہے مگر انوکھا نہیں۔ شاید قصے کی چھوٹائی کی وجہ سے اس سے زیادہ پیچیدگی نقشے کی ممکن ہی نہ تھی۔

مصنف ہم کو صحیفۂ فطرت انسانی کا ایک باریک بین پڑھنے والا معلوم ہوتا ہے۔ وہ

خوب سمجھتا ہے کہ محبت یا نفرت انسان کے دل میں کیوں کر پیدا ہوتی ہے کیوں کر وہ بڑھتی یا گھٹتی ہے۔انسانی جذبات کی ابتدا اور نشوونما کے قاعدے اُس کو بخوبی معلوم ہیں۔زہرا اور رضا کی محبت کی درجہ بدرجہ ترقی۔دل نواز کی شرارت کا آغاز اور بڑھنا۔اس شرارت کی کامیابی۔پھر پشیمانی کا آنا اور رفتہ رفتہ پشیمانی کا جنون کے قریب پہنچ جانا اور اُس کا انجام۔یہ سب کچھ ایک استادانہ انداز سے ہمارے سامنے لایا گیا ہے۔

مصنف اپنے بابوں کو شروع اور ختم خوب کرتا ہے۔

مصنف کو محاسن اخلاق سے محبت ہے اور رذائل اخلاق سے دلی نفرت۔یہ محبت اور نفرت ایسی صادق اور دلی ہے کہ پڑھنے والے پر اس کا اثر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔مثلاً دیکھیے رشید کی شراب خوری اور اُس کی خانگی زندگی کا ذکر جہاں جہاں کیا گیا ہے وہاں ایسے طور سے کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو قدرتاً نفرت پیدا ہوتی ہے اس صفت کے لحاظ سے ہم ''زہرا'' کو اچھے سے اچھے اخلاقی افسانوں میں شمار کرتے ہیں۔

یہاں تک ہم محض اصول فسانہ نگاری کے لحاظ سے اس کتاب کی بعض خوبیاں لکھتے رہے ہیں۔یہ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ بلا لحاظ اصول فسانہ نگاری محض خیال اور بیان کی خوبیاں اس کتاب میں کثرت سے ہیں اور غالباً یہی خیال اور بیان کی خوبیاں ہیں جنھوں نے سید سجاد حیدر صاحب کو یہاں تک گرویدہ کرلیا ہے کہ اردو محاورے کا خیال تک اُنھوں نے چھوڑ دیا اور ترکی طرز تحریر کی تقلید میں حد اعتدال سے بھی گزر گئے۔خوب صورت تشبیہیں اور پُرمعنی مگر مختصر ترکیبیں قریباً ہر صفحے پر ملتی ہیں۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔''جس طرح چڑیاں صبح کو دریچے کے قریب کے درختوں پر چہچہاتی ہیں اسی طرح یہ معصومیت کی پری۔۔۔۔اس دستک پر اپنی باریک آواز میں بول اٹھی۔''کون ہے''۔''اُس کی آنکھوں سے ایک برق سرور چمکی۔''اس مصنف کا ایک دل آویز طرز بیان ہے کہ چند فقروں میں ایک منظر کا نقشہ کھینچنا اور پھر ایک فقرہ ترجیع لکھ دینا پھر ایک اور منظر کا بیان چند فقروں میں کرنا پھر اُسی فقرۂ ترجیع کا اعادہ کرنا وعلیٰ ہذا۔اس کی دو مثالیں اس فسانے میں موجود ہیں۔ایک اُس مقام سے عین پہلے جہاں زہرا اور رضا باہم اعتراف الفت کرتے ہیں۔دوسرے جہاں زہرا مصیبت کے عالم میں

قبرستان میں پھر رہی ہے۔

ہم کو اس فسانے میں بعض کوتاہیاں بھی دکھائی دیتی ہیں اُن کا بھی کسی قدر بیان ضروری ہے۔ مصنف کو قصے کے مختلف حصص کے باہم تناسب کا کافی خیال نہیں ہے۔ فنون لطیفہ کے اصول غائیہ ایک ہی ہیں۔ مصوری، موسیقی، تعمیر، شعر اور ناٹک سب ایک ہی اصول پر مبنی ہیں۔ ان اصول غائیہ میں سے ہی پابندی تناسب بھی ایک اصول ہے۔ یہاں مصنف نے بعض چیزوں کو یکا یک ہمارے سامنے لاکر کھڑا کر دیا حالانکہ اُس سے کم وقعت کی چیزوں کے لیے اوّل ہم کو تمہیدی واقعات یا اشارات کے ذریعے سے تیار کیا گیا ہے اور پھر اُس شے کو ہمارے سامنے لایا گیا۔ مثلاً یکا یک ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ عثمان بک کو ایک پرانی بیماری کے دورے نے آدبایا اور وہ مر گیا۔ ہم کو اس سے پہلے صراحتاً یا کنایتہً کچھ بتایا ہی نہیں گیا کہ عثمان بک کو کبھی کوئی مرض تھا بھی۔ صرف سات الفاظ کے ایک فقرے میں ایک باوقعت شخص کو فسانے سے رخصت کر دیا۔ ''اس کی ایک پرانی بیماری نے عود کیا۔'' یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ پرانی بیماری تھی کیا؟ یہ ایک نقص ہے کہ ہم کو نہایت بدنما معلوم ہوتا۔ اصول کی رو سے فسانہ زندگی کی نقل مطابق اصل ہوتا ہے۔ فسانہ نگار کو اور اُس کی وجہ سے اُس کے پڑھنے والوں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ ارکان فسانہ کے بھیدوں اور حالات کو اس طرح جانتے ہیں کہ گویا وہ اُن کے ساتھ ہی رہتے سہتے ہیں۔ پس جب کہ اس فسانے میں ہم عثمان بک کے خاندان سے کئی سال سے واقف چلے آتے ہیں تو کیا وجہ کہ ہم کو یہ نہ معلوم ہو کہ عثمان کو کیا مرض تھا جس سے وہ مرا؟ اسی طرح رضا کا مدرسے میں انعام پانا اور نوکر ہونا بہت تیز رفتاری کے ساتھ بیان ہوا ہے تناسب کا خیال یہاں بھی نہیں رہا۔ اس نقص کی دو ایک مثالیں اور بھی اس فسانے میں موجود ہیں۔ کاش کہ مترجم صاحب ہی مصنف کی کمی کو پورا کر دیتے مگر شاید وہ اس کو اپنے فرائض مترجمانہ کے دائرہ سے خارج سمجھتے ہوں۔ شکر کی بات یہ ہے کہ اس قسم کے نقص دو ایک ہی ہیں۔

یہ فسانہ ترکوں کی طرز زندگی کی نسبت کچھ بہت نہیں بتلاتا۔ شاید اس کی وجہ بھی اس کا اختصار ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ قابل مترجم آئندہ ذرا بڑا فسانہ پسند فرما کر ترجمہ کریں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں کی نچ کی زندگی کچھ بہت وقائع خیز نہیں ہوتی۔ سید سجاد حیدر کے

ثالث بالخیر اور زہرا دونوں میں وہ گتھلک جو دلچسپی کا باعث ہے طلاق سے ہی پڑتی ہے۔ گویا اگر طلاق کی رسم موجود نہ ہو تو ترکوں کی زندگی سے ایسے واقعات اخذ کرنا ہی بعید از عمل ہے جن پر ایک دلچسپ فسانے کی بنیاد رکھی جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ اصلیت یہ نہیں ہے۔ بلکہ ترکوں کی زندگی بھی آخر انسانی زندگی ہے۔ اس لیے ضرور اس میں پیچیدگیاں واقع ہونی چاہییں جن سے فسانہ نگار اپنا مصالحہ حاصل کرتا ہے ہم مترجم صاحب سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ صرف دلچسپ اخلاقی کہانیاں ہی ہم کو نہ دیں گے۔ بلکہ ذرا ساتھ ہی ترکوں کی اندرونی زندگی کے نمونے بھی تو ہوں۔

ایک مسلمان زہرا اور ثالث بالخیر کو پڑھ کر یہ ضرور کہے گا کہ ترکوں کی زندگی اگر یہی ہے تو خدا جانے یہ کس مذہب وملت کے لوگ ہیں۔ ان میں اسلامیت تو خصوصیت کے ساتھ کہیں موجود ہے نہیں۔ طلاق اگر ان میں ہے تو عیسائیوں میں بھی ایک خاص شکل میں موجود ہے۔ پھر اور کون سا اسلامی دم چھلا ان کے لگا ہوا ہے۔

مصنف نے دو تین جگہ یہ دکھایا ہے کہ انسان کے غم واندوہ سے موجودات کا کارخانہ متاثر نہیں ہوتا۔ اس تقابل وتخالف کو محض کنائے کے ذریعے سے دکھایا جاتا تو نہایت اثر انگیز ہوتا مگر مصنف نے صراحت سے کام لیا ہے اور صاف صاف الفاظ میں تشریح بھی کی ہے۔ چناں چہ لکھا ہے: ''آفتاب مغرب میں اپنی آخری شعاعیں پھیلا رہا ہے کل یہ حسب معمول پھر نکلے گا۔ انسان کی مصیبتیں کائنات پر کچھ اثر نہیں کرتیں۔ نیچر بالکل بے پروا ہے۔'' (ص ۴۸) ''جواب میں ایک لفظ بھی نہ آیا۔ نیچر اپنا قانون نہیں بدلتی۔'' (ص ۶۳) ہمارے خیال میں اس تشریح سے لطف کا خون ہو گیا۔ دو تصویریں پہلو بہ پہلو رکھ دیجیے اور ناظرین کی سمجھ پر چھوڑ دیجیے کہ وہ اس تقابل کا مطلب سمجھیں۔ تشریح کے ذریعے سے اگر آپ ان کو سمجھانے بیٹھے تو آپ کو اپنے کلام کی تفسیر اور تنقید بھی خود ہی لکھنی چاہیے۔ انگریزی شاعر میتھو آرنلڈ نے رستم اور سہراب کے قصے کو نظم میں لکھا ہے اور جہاں رستم اپنے جگر پارے کے ایک کاری ضرب لگاتا ہے اور پھر اُس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تو میرا نور نظر ہے اور پھر رنج والم کی تصویر ناظرین کے سامنے آتی ہے اور آخر کار بدقسمت اور دل ریش رستم بیٹے کی بے جان لاش کے پاس دریائے جیحوں کے کنارے تنہا بیٹھا اپنی قسمت کو روتا رہ جاتا ہے وہاں اس تصویر کے

عین بعد کہا جاتا ہے۔ ''لیکن وہ عظیم الشان دریا برابر بہتا رہا اور اس میدان کے غبار اور شور سے نکل کر ستاروں کی دھندلی روشنی میں پہنچ گیا اور وہاں مسرت کے ساتھ خوازم کے سنسان میدان میں عزلت گزیں چاند کے نیچے حرکت کرنے لگا۔ الخ''

اس عبارت میں آخر تک کہیں ذکر نہیں کہ دریا کو رستم اور اُس کے غم والم سے کیا ہمدردی ہوسکتی تھی۔ صرف ایک شروع کے لفظ ''لیکن'' نے تمام تخالف کو ظاہر کر دیا۔ رستم کے غم والم کی تصویر ایک طرف ہے اور دریا کی حال مستی اور بے پرواہی دوسری طرف۔ بیچ میں ایک ''لیکن'' واقع ہے۔ پس اس سے زیادہ کہنا اصول فن کے رو سے گناہ ہے۔

اس قسم کی بے ضرورت اور مضر اثر تشریح کی ایک دو مثالیں اس سے کس قدر ملتی جلتی ہوئی اور موجود ہیں۔ زہرا اپنی لڑکی سے دور افتادہ بے خانماں مصیبت میں پھر رہی ہے اُس کو ایک بچے والی عورت نظر آجاتی ہے۔ یہ دیکھ کر بیتاب ہوجاتی ہے اور بچے کی نسبت اُس عورت سے باتیں کرتی ہے اور آہ سرد بھر کر آبدیدہ ہوکر یہ کہہ کر چل دیتی ہے ''میری بدنصیب بچی!'' اس معاملے کو ہر ایک سمجھتا ہے مگر مصنف بلاضرورت تشریح بھی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ''اُس عورت کے بچے کو دیکھ کر زہرا کو اپنا بچہ یاد آ گیا تھا اور اسی وجہ سے یہ ساری حرکتیں اُس سے سرزد ہوئیں جو اُس عورت کو مجنونانہ نظر آتی تھیں۔'' کوئی پوچھے اس تفسیر کی ضرورت کس کو تھی؟ اس سے منظر کی شعریت بالکل نثر خشک بن گئی۔

مترجم صاحب کو ترکی طرز بیان سے کچھ شغف معلوم ہوتا ہے۔ خیر اس پر ہم کو چنداں اعتراض بھی نہیں مگر اس قدر تقلید ہم گوارا نہیں کر سکتے کہ ایک ننھے سے موصوف کے ساتھ ایک کئی فٹ لمبی صفت لگادی جس کا سلجھانا بھی کارِ دارد۔ جیسے ''عالم طفولیت سے آگے قدم رکھنے والی اس سیزدہ سالہ لڑکی۔۔۔ الخ'' اس اسم اشارہ لڑکی مشارالیہ موصوف باقی تمام صفت۔

مگر بہر حال یہ چھوٹا سا فسانہ اکثر صفات کے لحاظ سے بالکل ایک نمونہ ہے اور ہم اس کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ اہل تصنیف وتالیف کو اس کی مثال سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

نیرنگ

## حواشی وحوالہ جات

۱۔ سروری، محمد عبدالقادر، ۱۹۲۷ء، دنیائے افسانہ، مکتبہ ابراہیمیہ اتحادی، حیدرآباد دکن
۲۔ گورکھپوری، مجنوں، سن ندارد، افسانہ، ایوان اشاعت، گورکھپور
۳۔ حسینی، سید علی عباس، سن ندارد، ناول کی تاریخ اور تنقید، انڈین بک ڈپو، لکھنؤ
۴۔ بخاری، سہیل، ڈاکٹر، بار اوّل، ۱۹۶۰ء، اردو ناول نگاری، مکتبہ جدید، لاہور
۵۔ فاروقی، احسن، نورالحسن ہاشمی، ۱۹۴۸ء، ناول کیا ہے؟، دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ
۶۔ فاروقی، احسن، ڈاکٹر، طبع اوّل، ۱۹۵۱ء، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، سندھ ساگر اکیڈیمی، لاہور نظر ثانی شدہ ایڈیشن
۷۔ سروری، محمد عبدالقادر، محولہ بالا، ص ۴
۸۔ نیرنگ، میر غلام بھیک، مارچ ۱۹۰۳ء، اردو زبان اور فسانہ نگاری، مشمولہ: ماہنامہ 'مخزن'، لاہور
۹۔ نظر، نوبت رائے، اگست ۱۹۱۰ء، اردو زبان اور ناول، مشمولہ: 'ادیب'، الہٰ آباد
۱۰۔ اے۔ ایچ۔، اپریل ۱۹۱۲ء، ناول نویسی، مشمولہ: ماہنامہ 'مخزن'، لاہور
۱۱۔ حسین، سید لطافت، ڈاکٹر، اکتوبر ۱۹۲۱ء، ناول نویسی، مشمولہ: اردو، کراچی
۱۲۔ شمسی، ضیاء الدین، ۱۹۲۳ء، قصہ نویسی، مشمولہ: ماہنامہ 'ہمایوں'، لاہور
۱۳۔ میر غلام بھیک نیرنگ کے حالات ڈاکٹر معین الدین عقیل کی مرتبہ کتاب، کلام نیرنگ، از، غلام بھیک نیرنگ (مکتبہ اسلوب، کراچی، اشاعت سوم، ۱۹۸۳ء) کے مقدمے سے لیے گئے ہیں۔
۱۴۔ ماہ نامہ، مخزن، جسے شیخ عبدالقادر (پ ۱۸۷۴ء۔م ۱۹۵۰ء) نے لاہور سے جاری کیا تھا اردو کا وہ رسالہ ہے جس نے اس عہد کے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اردو کی خدمت کی دعوت دیتے ہوئے جدید اور کلاسیکی ادب کی بزم سجائی۔ جس میں کئی نئے لکھنے والے جلوہ افروزہ ہوئے جو آگے چل کر بلند پایہ ادیبوں میں شمار ہوئے۔
شاعر مشرق علامہ اقبال اپنی نظم کوہستان ہمالیہ لے کر اسی بزم میں آئے۔ جسے اپریل ۱۹۰۱ء کے شمارے میں ان الفاظ کے ساتھ شائع کیا گیا کہ ''شیخ محمد اقبال صاحب۔ اقبال ایم۔ اے۔ قائم مقام پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور جو علوم مغربی و مشرقی دونوں صاحب کمال ہیں انگریزی خیالات کو شاعری کا لباس پہنا کر ملک الشعرائے انگلستان ورڈس ورتھ کے رنگ میں کوہ ہمالیہ کو یوں خطاب کرتے ہیں''۔ سید حسرت موہانی اپنے مضمون متروک الفاظ کے ساتھ سب سے پہلے اپریل ۱۹۰۲ء میں اسی بزم میں نظر آئے۔ سید سلیمان ندوی کی ادبی جہت کی جانب بڑھتے ہوئے قدموں کے نشان پہلے پہل معشوقۂ عرب کی یاد میں مارچ ۱۹۰۵ء میں سید سلیمان بہاری از لکھنؤ کے نام سے مخزن ہی میں دکھائی دیے۔ سید سلیمان ندوی نے اپنے پہلے مضمون کی اشاعت پر اپنے احساس کا اظہار کرتے ہوئے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اگرچہ بقول ان کے مجروح اور درماندہ قلم نے ہزاروں صفحے سیاہ کر ڈالے لیکن جو تسکین اور مسرت انھیں مخزن میں اپنے پہلے مضمون کی اشاعت سے ہوئی تھی۔ ویسی پھر کبھی میسر نہ ہوئی۔ مصور غم علامہ راشد الخیری کا پہلا افسانہ نصیر اور خدیجہ، جو ڈاکٹر حامد مرزا بیگ کی تحقیق کے مطابق اردو کا پہلا افسانہ ہے، وہ بھی مخزن ہی کے ذریعے ۱۹۰۳ء میں اردو دانوں تک پہنچا اور مولانا ابوالکلام آزاد کا پہلا مضمون فن اخبار نویسی جو مئی ۱۹۰۲ء میں از مولوی ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی مقیم کلکتہ کے نام سے مخزن میں طبع ہوا۔ تو اردو کے اس بلند و بالا صاحب طرز ادیب کے اس پہلے مضمون کے متعلق شیخ

عبدالقادر کا یہ بیان دلچسپی سے خالی نہیں کہ ''میں نی مخزن کے ابتدائی دور میں غلام بھیک نیرنگ سے کہہ رکھا تھا کہ آپ مخزن کے ہر پرچے پر تنقید لکھ کر مجھے بھیج دیا کیجیے۔ جب میر نیرنگ نی مخزن میں ابوالکلام آزاد کا مضمون دیکھا تو بہت بگڑے اور لکھا ''یہ تم نے کیا شائع کر دیا؟ مخزن بچوں کی مضمون نویسی کی مشق کے لیے جاری نہیں کی گیا''۔ پھر ایک عرصے بعد شیخ عبدالقادر کی ملاقات مولانا ابوالکلام آزاد سے شملہ میں ہوئی تو شیخ عبدالقادر نے مخزن کا وہ پرانا شمارہ جس میں ان کے بچپنے کا مضمون شائع ہوا تھا اسے دکھاتے ہوئے اس عہد کی یادوں کو تازہ کیا اور نیرنگ صاحب کی اس مضمون پر تنقید کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''اب مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے اسی وقت آپ کی ادبی منزلت کو پہچان لیا تھا۔'' شیخ صاحب کی اس بات پر مولانا بہت محظوظ ہوئے۔ مخزن کے لیے اور جن اہل قلم کی نگارشات زینت بنیں اُن میں مولانا شبلی نعمانی، حکیم ناصر نذیر فراق دہلوی، قاری سرفراز حسین عزمی، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، اکبر الہٰ آبادی، مولانا شرر، خواجہ حسن نظامی، عزیز لکھنوی، نادر کاکوروی، مولانا حبیب الرحمن شیروانی، پنڈت کیفی، تلوک چند محروم، منشی دیا نرائن نگم، لالہ سری رام اور پروفیسر مرزا محمد سعید کے علاوہ کئی اہم نام شامل ہیں۔

۱۵۔ زہرا (ایک ترکی ناول کا ترجمہ) سجاد حیدر یلدرم، طبع ثانی، ۱۹۳۱ء، مطبع مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

## Abstract

This article presents the text of an essay Urdu zaban aur fasanah nigari(Urdu language and short story writing) by Mir Ghulam Bheek Nairang with necessary notes, first published in monthly Makhzan, Lahore 1903 based on an Urdu translation of Zahra, a Turkish novel, by Syed Sajjad Haider Yildrim. Nairang was reckoned to be a writer of high stature. The essay was intended to evaluate the short story translated based on principles of English criticism as Urdu had little critical writings for the emerging genre of short story then. The essay describes the plot of the story and shows some of the areas where the essayist was not convinced with the writer. The article provides a brief life sketch of Nairang in the introduction of the translation, revealing he was politically and socially active in days of his life.

**Keyword:** Mir Ghulam Bheek Nairang, Sajjad Haider Yildrim, Turkish novel Zahra, Urdu translation of Turkish novel